ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.7,Issue No.4 (2025)
(October to December)

حسن منظر کی ناول نگاری: سماجیاتی مطالعہ

The Novel Writing of Hassan Manzar: A Sociological Study

محمد ادریس

پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، ملتان

ڈاکٹر رافعہ ملک

شعبہ اردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، ملتان

Muhammad Idrees
Ph.D Scholar Urdu, NCBA&E, Sub Campus, Multan
MIdrees122310325@ncbaemultan.edu.pk
Dr. Rafia Malik
Department of Urdu, NCBA&E, Sub Campus, Multan
rafiamalik7151@gmail.com

Abstract:
Hassan Manzar is regarded as a significant voice in modern Urdu fiction, whose novels offer a profound reflection of social realities and human experiences. This research article presents a sociological study of Hassan Manzar's novelistic discourse, aiming to explore the representation of social structures, class dynamics, cultural values, and the intricate relationship between the individual and society in his works. The study adopts a qualitative research methodology, employing textual and thematic analysis of selected novels. The findings reveal that Hassan Manzar portrays societal inequalities, the dilemmas of the middle class, and the complexities of urban life with remarkable realism and critical insight. His narratives highlight issues such as identity crisis, shifting social norms, and the psychological tensions embedded in human relationships. Moreover, his fiction reflects the impact of modernity and socio-cultural transformation on individual consciousness. The study concludes that Hassan Manzar's novels serve as a powerful medium of social critique, contributing significantly to the development of sociological perspectives in Urdu literature.

Keywords: Hassan Manzar, Urdu Novel, Sociological Study, Social Realism, Class Structure, Cultural Values, Modernity, Individual and Society

حسن منظر اکیسویں صدی کے ایک نامور ناول نگار کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا اصل نام سید منظر حسن ہے۔ کچھ عرصہ انھوں نے حسن معوض کے قلمی نام سے بھی ادب تخلیق کیا۔ حسن منظر ۴۔مارچ ۱۹۳۴ء کو ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ یہ علاقہ بھارت کے موجودہ صوبہ اتر پردیش میں واقع ہے۔ ان کا تعلق سادات خاندان سے ہے جو کئی صدیوں پہلے عرب سے ہندوستان منتقل ہوا۔ ان کا خاندان جنگجو خاندان تھا۔ ان کے اجداد نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔ ان کے دادا سید مہدی حسن انگریز دور میں محکمہ جنگلات میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور حکومت برطانیہ نے ان کی خدمات کے اعتراف

میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ ان کے پاس کتابوں کا وسیع ذخیرہ تھا اور وہ علم و ادب کا گہرا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے والد بھی سائنس کے شعبے میں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے یوں حسن منظر کو علم و ادب سے محبت کا جذبہ وراثت میں ملا۔ تقسیم ہند کے وقت ان کی عمر محض تیرہ برس تھی انہوں نے خاندان کے ہمراہ ہجرت کی اور لاہور شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ یوں تیرہ برس کی عمر میں انھوں نے تقسیم ہند کے موقعہ پر فسادات اور ہولناک قتل و غارت کا جو مشاہدہ کیا اس نے ان کے شعور پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ حسن منظر نے جب ادب کی تخلیق کا آغاز کیا اس وقت ان کی عمر چالیس برس سے زیادہ تھی۔ مہرونہ لغاری رقمطراز ہیں:

> "کسی بھی ادیب کی زندگی کے متنوع پہلو ہو سکتے ہیں۔ جہاں وہ گھریلو ذمہ داریوں، پیشہ وارانہ تقاضوں کے ساتھ نباہ کر رہا ہوتا ہے وہیں اس کی زندگی کا ایک رخ اس کی ادبی یا تخلیقی پہلو داری بھی ہے۔ اس کی یہ جہت اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ارتقا پذیر رہتی ہے۔ یہ ادیب کی زندگی کا ایک ایسا مخفی پہلو ہے جو ہمہ دم اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی جزیرے کی مانند یہ اچانک دریافت ہوا۔ اور دنیا کے سامنے منظر عام پر آیا۔ بلکہ قطرہ قطرہ اکتساب کا عمل ہمیشہ اس کے ساتھ موجود رہتا ہے۔ یوں ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو اپنی ذہنی پختگی کے دور میں ہی بے مثل نگارشات کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور ایسے بھی جو اپنی زندگی کی چار پانچ دہائیاں گزارنے کے بعد اپنی شناخت کراتے ہیں۔"(۱)

حسن منظر بھی ایسے ہی ایک منفرد ادیب ہیں جنھوں نے نہایت پختہ عمر میں ادب تخلیق کرنا شروع کیا اور اپنی گہری سیاسی و سماجی اور تخلیقی صلاحیتوں سے عہد کے نامور ادیبوں میں شامل ہو گئے۔ وہ پریم چند کی کہانیوں سے سب سے زیادہ متاثر تھے اور انہوں نے ادبی تحریک پریم چند کی تخلیقات سے حاصل کی۔ حسن منظر کے چھ افسانوی مجموعی (۱) رہائی ۱۹۸۱ء (۲) ندیدی ۱۹۸۲ء (۳) انسان کا دیش ۱۹۹۱ء (۴) سوئی بھوک ۱۹۹۷ء (۵) ایک اور آدمی ۲۰۰۱ء اور (۶) خاک کا رتبہ ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئے۔ ان کے بیس سے زائد افسانہ جو مختلف وقتوں میں مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ایسے بھی ہیں جو کسی افسانوی مجموعہ میں شامل نہیں۔ انہوں نے کمال اظہر کے نام لکھے خطوط کو منظر کے خطوط (کمال اظہر کے نام) کے عنوان سے ۲۰۱۱ء میں ادارہ فکر نو کراچی سے شائع کرایا۔ حسن منظر نے اپنی ایک ڈائری کو "بوسیدہ صفحے" کے عنوان سے ۲۰۱۳ میں شائع کرایا۔ ایک طویل دورانیہ کا ڈرامہ ۲۰۱۴ میں "سناٹے سے پہلے" کے عنوان سے شائع کرایا۔ ان کی بچوں کی کہانیوں پر مشتمل ایک کتاب "جان کے دشمن" ۲۰۰۴ میں شہر زاد کراچی سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ تراجم کی چار کتابیں "منگل سوتر"، "پریم چند گھر میں"، "آرٹ کا مفہوم"، "لیوٹا لسٹائی کا مذہب" بھی شائع ہوئیں۔ دو درجن سے زائد مضامین مختلف اخبارات میں شائع ہوئے۔ ادبی تنقیدی مضامین بھی مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کے پانچ ناول (۱) العاصفہ (۲) دھنی بخش کے بیٹے (۳) وبا (۴) بیر شیبا کی بیٹی اور ماں بیٹی اور (۵) انسان اے انسان (۶) اے فلک نا انصاف شائع ہوئے۔ حسن منظر کو افسانی مجموعہ "خاک کا رتبہ" پر ۲۰۰۷ء میں بہترین نثری کتاب کا "مولوی عبدالحق ایوارڈ" دیا گیا۔ اس کے علاوہ حکومت سندھ نے ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے "شیخ ایاز" نام سے نوازا۔

حسن منظر کبھی ترقی پسند تحریک سے باضابطہ طور پر منسلک نہیں رہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ ترقی پسند نظریات کے مکمل طور پر قائل تھے اور ان کی تخلیقات ان کے ترقی پسند نظریات کی حقیقی جھلک پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے بطور ڈاکٹر

پیشہ وارانہ زندگی کے دوران دنیا کے مختلف ملکوں میں خدمات انجام دیں۔ ذریعہ معاش کی تلاش کے لیے کئی ملکوں میں قیام کے دوران انہوں نے دنیا کی مختلف تہذیبوں اور ان کے مسائل کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور کہانیاں تلاش کیں۔ مہر ونہ لغاری رقمطراز ہیں:

> "ان کا مشاہدہ اور مطالعہ کسی ایسے سیاح کا نہیں ہے جو چند روز کے لیے کسی علاقے میں آئے اور پھر کندھے پر تھیلا لٹکائے زندگی کی ایک بصری تصویر اور تاثر لے کر روانہ ہو جائے۔ حسن منظر کی پیشہ وارانہ زندگی بھی اس مشاہدے اور مطالعہ میں ان کی مدد کرتی ہے۔ پھر حسن منظر کا فطرت اور فطرت انسانی سے جو لگاؤ ہوا ہے یہ بھی ان کے فن کی جہات کا تعین کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ان کا وسیع مطالعہ جو کسی بھی قوم کے مذہب، کلچر اور طرز حیات کا احاطہ کرتا ہے۔ یوں حسن منظر یقیناً اردو ادب میں ایک نئی طرز اور انفرادیت کے حامل ہیں۔"(۲)

حسن منظر نے بطور تخلیق کار تخلیق ادب کے لیے چند اصولوں کا انتخاب کیا اور ہمیشہ ان اصولوں پر کار بند رہے۔ یوں اکیسویں صدی میں وہ ایک ایسے تخلیق کار کے طور پر سامنے آئے جو خالص انسانی زندگی کی مختلف جہتوں کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ وہ تین عناصر کے قائل ہیں سچائی، مقصدیت وافادیت اور خوبصورتی۔ اور وہ ان تینوں اصولوں پر ہمیشہ کار بند رہے ہیں۔

> حسن منظر کا پہلا ناول العاصفہ شہر زاد پبلشرز کراچی سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک مختصر ناول ہے جس میں ستائیس ابواب شامل ہیں۔ انہوں نے اس ناول کو تقریباً بارہ سال کی طویل مدت میں مکمل کیا۔ اجمل کمال رقمطراز ہیں: "العاصفہ عربی زبان میں طوفانی ہوا کو کہتے ہیں اور اردو ناول کے تہذیبی پس منظر اور نفس مضمون کو دیکھتے ہوئے یہ نام بہت موضوع معلوم ہوتا ہے۔ ناول میں پیش آنے والے واقعات ایک بے نام عرب ملک میں پیش آتے ہیں اور اس ملک کے شہروں کو بھی محض ان کے ناموں کی ابتدائی حروف "ک" یا "ن" سے شناخت کیا گیا ہے۔"(۳)

اس ناول میں حسن منظر نے ایک ایسے عرب ملک کو موضوع بنایا ہے جس کا نام انہوں نے براہ راست لینا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے اس ملک کا نام مخصوص نا کر کے دراصل اس کہانی کو ان تمام ملکوں کے غریب اور پسے ہوئے طبقے کا استعارہ بنایا ہے جو غاصب اور صاحب اقتدار اور صاحب حیثیت طبقے کے ظلم اور جبر کا نشانہ بنتے ہیں اور قابل رحم حالت میں زندگی کی سانسیں پوری کرتے ہیں۔ اسی پہلو کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اجمل کمال نے لکھا ہے:

> "حسن منظر نے اپنے ناول کو متعدد ایسے مسلمان ملکوں کا استعارہ بنا دیا ہے جہاں سیاسی جبر اور منافقانہ مذہبیت کا تسلط ہے اس جبر اور منافقت کے ہاتھوں ان معاشروں میں رہنے والوں کی روحیں کس طرح سخ ہوتی چلی جاتی ہیں اور زندگی کی امنگ کیوں کر ان کی جسموں سے نچوڑ لی جاتی ہیں اس کا گہرا احساس "العاصفہ" کے مرکزی کرداروں نوجوان زید اور اس کی بہن کی زندگیوں کے نشیب و فراز میں سمو دیا گیا ہے۔"(۴)

ناول "العاصفہ" عربوں کی زندگی کے بعض منفی پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار "زید" خود بھی ایک عرب نوجوان ہے لیکن وہ عرب کے اس پسے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو باشعور ہے اور اعلی طبقے کے ظلم و جبر کے خلاف نفرت

کے جذبات تو رکھتا ہے لیکن عملی طور پر کوئی اقدام کرنے یا مزاحمت کی تحریک چلانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یوں وہ اس صورتحال میں بے بسی کی تصویر ہے جو ظلم کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے۔ نفرت کرتا ہے لیکن سوائے برا بھلا کہنے کے کچھ نہیں کر سکتا۔ ناول میں عرب تہذیب بالکل حقیقی انداز میں سامنے آتی ہے ناول نگار نے زید کے والد کی شخصیت کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ بھی دلچسپ ہے۔ عرب ممالک کی ماضی کی تاریخ نہایت تلخ ہے غربت، بے روزگاری، مہنگائی جیسے مسائل سے نبرد آزما اس قوم کی خوش قسمتی کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں تب ہوا جب وہاں سے تیل کی دریافت ہوئی۔ یہ خطہ چند دہائیوں میں ترقی کرتے ہوئے دنیا کے پر آسائش اور ترقی یافتہ ملکوں میں شامل ہو گیا۔ لیکن اس ترقی اور خوشحالی کے اثرات حکمران اور اعلی طبقے کی زندگی پر تو نمایاں نظر آتے ہیں لیکن نچلا طبقہ خصوصا دیہاتوں میں اور مضافاتی شہروں میں اس کے اثرات نہیں پہنچے بلکہ حکمران اور اعلی طبقہ ان لوگوں کو جانوروں کی طرح استعمال کرتے ہوئے سستی مزدوری حاصل کرتا ہے اور بدلے میں معمولی اجرت فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کا جنسی اور سماجی استحصال بھی ایک عام صورتحال ہے۔

زید کا والد علی ابن سعید ایک ایک بدو ہے اور اسی کے جسمانی خدوخال اور چہرے کی وضع قطع عام بدوؤں کی طرح ہے لیکن اس کی بیوی ایک خوبصورت مصری خاتون ہے جو زید کی والدہ ہے۔ اس کی شاعرہ بہن لولو بھی گھر کی تمام خانہ داری ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے باوجود ماں کے ظلم اور باپ کی خود غرضی اور لالچ کا شکار ہے۔ وہ اپنے خاندان کے حالات بدلنے کے لیے نہایت سخت محنت کرتا ہے۔ کئی تیل کمپنیوں میں ملازمت کرتا ہے اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف کبھی عملی اور کبھی نظری جدوجہد بھی کرتا ہے لیکن پھر ایک وقت آتا ہے جب اسے امریکی افسروں کو خوش کرنے کے لیے وہی کام کرنا پڑتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے باپ سے نفرت کرتا تھا ناول نگار اس صورتحال کو یوں بیان کرتا ہے:

> "زید اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود اس گھٹن زدہ معاشرے کا حصہ ہے۔ وہ ساری زندگی باپ کے جن غلط کاموں سے نفرت کرتا رہا بالآخر وہ کام اسے بھی کرنا پڑتے ہیں۔ اپنے امریکی افسروں کو خوش کرنے کے لیے اسی شراب بھی اسمگل کرنا پڑتی ہے اور ان کی داشتاؤں کو بھی پہنچانا پڑتا ہے۔"(۵)

وہ ہمیشہ اپنے ان کاموں کی وجہ سے خود کو ملامت تو کرتا رہتا ہے لیکن روزی روٹی کا سارا دارومدار ان امریکیوں کی کمپنیوں سے وابستہ ہونے کی وجہ سے انکار نہیں کر سکتا۔ ناول "العاصفہ" عرب ممالک میں کام کرنے والی غیر ملکی کمپنیوں کے کردار کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ عرب کی کالے سونے یعنی تیل کی پیداوار کا ایک بڑا دھن ان کمپنیوں کے کھاتے میں جاتا ہے۔ اور دوسری طرف ان کمپنیوں سے منسلک غیر ملکی خصوصا امریکی شہریوں کے لیے ملکی قوانین بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ حسن منظر اس صورتحال کے خلاف ناول میں یوں احتجاج ریکارڈ کرواتے ہیں:

> "سب جانتے ہیں سفید تاجر ملک کو لوٹ رہے ہیں لیکن ملک تک میں ہمت نہیں کہ انہیں سے نکل جانے کو کہے۔ ایسا زور صرف اپنے ملک والوں پر چلتا ہے یا ان کام کرنے والوں پر جو گرے پڑے ملکوں سے یہاں آتے ہیں اور تیل کا یہ دھوکہ دھڑی کا کام تو جب ہی ختم ہو گا۔ جب ہماری زمین اور ہماری سمندر کی تہہ سے تیل کا آخری قطرہ تک کھینچ کر نہیں نکال لیا جاتا۔"(۶)

عرب ملکوں میں شراب اور زنا ممنوع ہے اور سخت سزائیں مقرر ہیں لیکن ان مغربی تاجروں کے لیے یہ قانون مردہ ہو جاتا ہے اور وہ مخلوط تقریبات منعقد کر کے خوب عیاشی کرتے۔ ساحلوں پر نیم برہنہ حالت میں نہاتے ہیں اور پورے ملک میں جو چاہے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کلچر کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> "کسی کلچر میں روح نظام خیال سے پیدا ہوتی ہے یعنی ایک ایسا تصور حیات جو انسان میں خیر کی قوتوں کو ابھارے۔ جو انسان کی زندگی میں مقصد اور نئے معنی پیدا کرے تاکہ وہ عمل کی طرف راغب ہو سکے اور اس کے عمل سے انسانی رشتے مستحکم و جاندار ہو سکیں۔ یہ نظام خیال جتنا معاشرے کی روح میں پیوست ہو گا۔ اس اعتبار سے اس میں تنگ نظر کی بجائے وسیع القلبی پیدا ہو گی۔"(۷)

لیکن اس ناول سے قطع نظر عربوں کے ہاں ان کا تاریخی کلچر اور تہذیبی ساخت اپنی روح سے الگ ہوتی اور اپنی سمت سے ہٹتی نظر آتی ہے جس کے خوفناک نتائج عربوں کی شناخت کے لیے شدید خطرات پیدا کر رہے ہیں لیکن عرب ابھی تک اس کھیل میں بے بسی تماشائی بننے کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ مہر ونہ لغاری رقمطراز ہیں:

> "معاشرہ علم کی دولت سے بے نیاز ہے نا تو حکمران طبقہ اور نہ ہی خود عوام آنے والے وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ تیل کی دولت عرب معاشرے کو مجہول بنا چکی ہے۔"(۸)

یہ ناول عرب معاشرے کی زوال اور پستی کی آخری حدوں کی عکاسی کرتا ہے۔ تیل کی کمائی مثالی معاشرے کی بنیاد رکھنے کی بجائے عیاشی اور غیر اخلاقی سرگرمیوں پر خرچ ہو رہی ہے۔ امریکی اس خطے کی معدنی دولت کی مدد سے اپنی طاقت میں اضافہ کر رہے ہیں اور ان ملکوں کے دفاعی نظام کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اس ناول کی کامیاب پیش کش پر ڈاکٹر آصف فرخی حسن منظر کی فنی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> "چند صفحوں میں انسانی زندگی کو سمیٹ لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ اور اس ہنر سے کام لیتے ہوئے دنیا کے انوکھے وقائع نگار ہیں۔ چھوٹی چھوٹی اور بظاہر ضمنی معلوم ہونے والی تفصیلات میں جیسے زندگی کا گہری معنویت کو بھر لینے اور بہت سے مواد کو مختصر پیرائے میں سمو لینے کی وجہ سے ان کے افسانوی اسلوب میں ایک طرح کی بازیافت نظر آتی ہے۔"(۹)

ایک کلچر جب تخریب کا شکار ہو کر زوال کی راہ پر گامزن ہوتا ہے تو ہر فرد ذہنی کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں بھی یہی صورتحال سامنے آتی ہے۔ حسن منظر کا دوسرا ناول "دھنی بخش کے بیٹے" شہرزاد پبلشرز ۲۰۰۸ میں کراچی سے شائع ہوا۔ حسن منظر کے تمام ناولوں میں یہ ناول نسبتاً طویل ناول ہے۔ انھوں نے اس ناول کو تین سالوں میں مکمل کیا۔ انہوں نے اس ناول میں سندھ کی سرزمین کو موضوع بناتے ہوئے سندھی معاشرے کی کئی ایک سماجی خرابیوں کو موضوع بنایا ہے۔ خصوصاً جاگیرداری نظام کی خرابیوں کے اثرات کی جھلک پیش کی ہے۔ اور ساتھ ہی دیار غیر میں جا کر روزگار تلاش کرنے والے پاکستانیوں کے مسائل بھی اجاگر کیے ہیں۔ دھنی بخش سندھ کا ایک بڑا جاگیردار تھا۔ یہ کردار حقیقی ہے یا فرضی ناول نگار نے اس حوالے سے کوئی معلومات نہیں دیں۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ یہ ایک فرضی نام ہے ناول کا عنوان "دھنی بخش کے بیٹے" بھی نہایت معنی خیز ہے۔ ایک جاگیردار جو ہزاروں ایکڑ اراضی کا اکلوتا مالک تھا اس کے تین بیٹے بڑا خدا بخش، منجھلا علی بخش اور سب سے چھوٹا احمد بخش اس ناول کے مرکزی کردار ہیں ان تینوں کرداروں کی اگلی

نسلیں بھی اس ناول کی کہانی کے تسلسل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بڑا بھائی باپ کی موت کے صرف چار سال بعد موت کا شکار ہو گیا۔ تب منجھلا بیٹا اس موقعہ پر سوگ منانے کی بجائے خوشی کا اظہار کرتا۔ ناول نگار نے اس کی کیفیت کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"علی بخش نے انگڑائی لے کر کہا۔ سوگ کیوں مناؤں۔ جائیداد کا ایک وارث کم ہو گیا۔ یہ سوگ منانے کی بات ہے؟ دونوں ہنس پڑے۔"(۱۰)

یہی منجھلا بیٹا اس ناول میں وہ کردار ہے جس کی پیش کش کے ذریعے ناول نگار نے جاگیر داری نظام کے اس تلخ پہلو کو اجاگر کیا ہے جو اس معاشرے کی بہت سی سیاسی، تہذیبی اور سماجی برائیوں کی بنیاد بن رہا ہے۔ ان تینوں بھائیوں کی ایک اکلوتی بہن عائشہ بھی ہے جو پہلے صرف آٹھ سال کی عمر میں اچانک اندھی ہو گئی اور پھر اس کے بعد موت کا شکار ہو گئی۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جس جگہ سے بدی کی پھوار اٹھتی ہے نیکی کی کرنیں بھی وہیں سے نکلتی ہیں۔ یوں اس برائی کے نظام کے خلاف مزاحمت بھی شروع ہو جاتی ہے۔ علی بخش کے گھناؤنے کردار کے سامنے احمد بخش کا کردار امید کی ایک کرن بن کر سامنے آتا ہے۔ اس ناول میں پڑھا لکھا طبقہ بھی موجود ہے۔ ان پڑھ بھی اور اس ناول میں مذہبی اعتقادات کی اہمیت بھی سامنے آتی ہے۔ سندھ کے معاشرے میں وڈیرہ شاہی اور جاگیر داری نظام نے اپنی اتنی مضبوط گرفت ڈالی ہوئی ہے کہ لوگ ذہنی غلام پیدا ہوتے ہیں اور ذہنی حاکم پیدا ہوتے ہیں۔ اس سسٹم نے نفسیاتی طور پر لوگوں کو اپنی جکڑ میں لے رکھا ہے جس کا نقشہ ناول نگار نے بڑی مؤثر مہارت کے ساتھ کھینچا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مشکل یہ ہے یہاں کے لوگ بڑے ہونے پر خود اپنی شناخت بدل دیتے ہیں۔ بڑی آسانی سے حاکم و محکوم بن جاتے ہیں۔ ساتھی نہیں رہتے۔ خواہ اس کی توقع ان سے کی جائے یا نہیں۔ کم حیثیت پرانے دوست جب ملتے ہیں ایسے ملتے ہیں جیسے غلام ہوں اور باحیثیت پرانے ساتھی خود اسے اپنا بیاج سمجھنے لگتے ہیں۔ جسے ادا کرنا ان کے نزدیک کم حیثیتوں پر فرض ہوتا ہے۔"(۱۱)

سلسل ذہنی غلامی نے لوگوں میں مزاحمت کی خواہش اور صلاحیت ختم کر دی ہے اور لوگ تمام ظلم و جبر کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر تسلیم کر چکے ہیں کہ جاگیر دار، زمیندار اور وڈیرے ان سے اعلیٰ وارفع مخلوق ہیں۔ یہ لوگ اپنے مزارعوں اور کسانوں کو اس قدر خوف میں مبتلا رکھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنی شناخت بھول جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستانی معاشرے میں پیروں فقیروں پر اندھے اعتماد اور اعتقاد کو بھی سامنے لایا گیا ہے۔ سندھ کا معاشرہ آج بھی بیمار ذہنیت کا معاشرہ ہے جب دنیا چاند پر پہنچ چکی اور سوشل و ڈیجیٹل میڈیا نے عام آدمی کو ذہنی انقلاب کے ذریعے پوری دنیا کے حالات کا گہرا شعور عطا کر دیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ وڈیروں اور جاگیرداروں نے اس تبدیلی کی ہوا ابھی ان لوگوں تک نہیں پہنچنے دی۔ علی بخش کے مظالم کی ایک داستان ہے جس میں سے ایک دو واقعات اس اقتباس میں ملاحظہ فرمائیں:

"ایک دفعہ اس نے ایک کسان کے لڑکے کو جو بنا پوچھے بنگلے میں آ گیا تھا دو گھنٹے الٹا ٹانگ کر رکھا تھا اور ایک دفعہ جب شکار ہاتھ نہیں آ رہا تھا اس نے ہر اس جان دار کو مارا تھا جو نظر آتا جا رہا تھا۔"(۱۲)

علی بخش کے مظالم سے علاقے کے تمام کسان، مزارعے اور کمی کمین خوف زدہ رہتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ حسن منظر کا تیسرا ناول "وبا" شہرزاد پبلشرز نے ۲۰۰۹ میں شائع کیا۔ یہ ایک مختصر ناول ہے جو صرف ۱۰۷ صفحات پر

مشتمل ہے۔ یہ ایک ہسپتال کی ۱۹۶۰ کی دہائی کی کہانی ہے۔ اس عہد میں کراچی میں صحت کی صورتحال کافی خطرناک تھی اور مختلف وبائیں پھوٹتی رہتی تھیں۔ حسن منظر نے اس ناول کے انتساب میں لکھا:

"ان سب کے نام جن کے درمیان میں نے بیماریوں اور وباؤں کے خلاف جنگ کرنے والوں میں زندگی بھر خود کو پایا اور اس عالمی وبا سے جنگ کرنے والوں کے نام جس نے کمزور نہتے ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔" (۱۳)

حس منظر نے بطور ڈاکٹر خود بھی زندگی بھر ہسپتالوں میں کام کیا اور حادثات، جنگوں اور وباؤں سے متاثرہ افراد کے لیے اپنی زندگی کی خوشیاں قربان کیں۔ مخلصانہ طور پر طب کے پیشے سے وابستہ شخص ہی اس پیشے کی ذمہ داریوں اور حساسیت کی نوعیت سب سے زیادہ حقیقی طور پر جان سکتا ہے اور اس پیشے سے وابستہ لوگوں کے جذبات اور قربانیوں کا احساس رکھتا ہے۔ اس ناول کا آغاز ایک ہسپتال میں چیچک کی وبا کے شکار لوگوں کے علاج معالجے کے مناظر سے ہوتا ہے ڈاکٹر عبد اللہ، ڈاکٹر مدحت، ڈاکٹر انیس اس کے علاوہ نرسنگ سٹاف اور وارڈ بوائز کی زندگی اور ہسپتال میں خدمات کے دوران جذبات کی نہایت متاثر کن انداز میں جھلک پیش کی ہے۔ بیماری اور وبا جیسی صورتحال انسان کو اپنے خیالات و جذبات اور سوچ بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے اور رحم کے جذبات پیدا کرتی ہے اس نقطہ نظر کا اظہار کرتے ہوئے ناول نگار رقمطراز ہیں:

"وبا جہاں اور تبدیلیاں لاتی ہے۔ ایک دوسرے کے لیے غیر لوگوں کو نزدیک لے آتی ہے۔ خشونت سماج میں مرتبہ رکھ رکھاؤ۔ دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ دونوں کے ہی گزر جانے پر حساس طبع افراد کو خیال آتا ہے۔ ایک ساکت بے حس معاشرہ کے لیے شائد وبا بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی جنگ" (۱۴)

ہسپتال ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر وقت سسکتی، آہیں بھرتی اور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا انسانوں کی کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ہسپتال کی زندگی انسان کے احساس و شعور پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے لیکن اگر ایک ڈاکٹر، ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ادیب بھی ہو تو اس کی جو کیفیات ہوں گی اس طرف متوجہ کرتے ہوئے ناول نگار رقمطراز ہیں:

"دنیا کا سکون جسے جنگ قحط، وبا، ہالا چالا، بہیا (باڑھ) اور طوفان تلپٹ کر کے رکھ دیتے ہیں جتنا ایک زبان کے ادیبوں پر اثر انداز ہوتے ہیں کسی نہ کسی شکل میں تھوڑا یا بہت دوسری زبانوں کے ادیب بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ لیکن سب ایک طرح نہیں۔ اس کے پیچھے ان کا سماجی شعور اور آگہی کام کرتی ہے اور مصنف کی شخصیت کو بھی سامنے لے آتے ہیں۔" (۱۵)

وبا جب پھیلتی ہے تو اچانک اور بہت تیزی سے پھیلتی ہے اور یہ ہر طبقے، رنگ، نسل اور قوم کے لوگوں کو بلا تفریق نشانہ بناتی ہے اس ناول میں بھی اسی صورتحال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹروں کی زندگی معاشرے کے ہر طبقہ سے زیادہ متاثر ہوتی ہے جنھیں خصوصاً جنگ یا وبا کے دنوں میں ہنگامی طور پر دن رات کام کرنا پڑتا ہے۔ مہرونہ لغاری رقمطراز ہیں:

"معاشرتی رویوں کی عکاسی کے لیے حسن منظر کا یہ ناول ایک ایسا بہترین سٹیج ہے جس میں معاشرہ اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے جس میں ہر کردار آتا ہے۔ اپنی اپنی

سماجی حیثیت کے مطابق اپنا کردار ادا کرتا ہے اور ناول کے مجموعی تاثر میں اضافہ کرکے واپس چلا جاتا ہے۔"(۱۶)

اس ناول میں حسن منظر بنیادی طور پر وبا سے متاثرہ لوگوں اور ہسپتالوں میں ڈاکٹروں کی خدمات کے دوران ذہنی و نفسیاتی کیفیات اور قربانیوں کو اجاگر کرتا ہے جس میں وہ بے حد کامیاب رہے ہیں۔ حسن منظر کے دو مختصر ناول "بیر شیبا کی لڑکی" اور "ماں بیٹی" شہرزاد پبلشرز کراچی سے ۲۰۱۰ میں ایک ساتھ شائع ہوئے۔ ان ناولوں میں مرد کی بالادستی والے معاشرے میں عورت کے استحصال، خواہشات کے قتل اور زندگی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ماں کی اولاد سے محبت کے جذبات کی بھی خوب عکاسی کی ہے رابیکا جو کہ ناول بیر شیبا کی مرکزی کردار ہے دوسری جنگ عظیم کے متاثرین میں سے ہے۔ راوی کی بیان کردہ کہانی سے تاثر ابھرتا ہے کہ ناول کے راوی خود نگار ہیں جو رابیکا کی کہانی بیان کرتے کرتے اپنی ماں کی خود سے محبت کی روداد گہرے جذبات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ رابیکا کو دوسری جنگ عظیم کے دوران اس کے والدین کی موت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا پڑی۔ رابیکا کو ایک کرسچیئن فیملی نے مرنے سے بچالیا۔ اس خوفناک منظر کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے:

> "اس نے ادھر ادھر دیکھ کر میری ماں سے کہا، اسے میں رکھوں گی۔ میری بیٹی ہے۔ سولا، ان تینوں کو آپس میں کوئی مشترک جذبہ ظاہر نہیں کرنا ہے۔ نہ ماں باپ کو بیٹی کے لیے نہ بیٹی کو ماں باپ کے لیے۔ انہوں نے انہیں کھڑے ہونے کے لیے کہا اور ساتھ ہی اپنے پیچھے آنے کو دونوں گہری سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ غیر عورت میرا ہاتھ تھامے رہی اور اس کے شوہر کا ہاتھ خود اس کے دور کے کندھے پر تھا۔ اس نے اپنے پنجے اور ایڑیاں جیسے کنکریٹ کے فرش پر دھنسا رکھے تھے۔ میرے جبڑے اتنی سختی سے بند تھے کہ ان میں درد ہونے لگا۔ پھر بھی میں اس صدمے سے اندر ہی اندر ہل رہی تھی اور میری آنکھیں خشک تھیں۔ میرے ماں باپ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مجھ سے دور ہوتے گئے۔ لیکن انہوں نے میرے لیے جو سب سے بڑی قربانی دی وہ یہ تھی کہ ایک بار بھی پلٹ کر انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔"(۱۷)

رابیکا اس اچانک حادثے کے بعد اپنے والدین سے بچھڑ گئی، اس کے ساتھ یہ حادثہ صرف اس لیے پیش آیا تھا کہ وہ ایک یہودی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کرسچیئن فیملی کے ہاں ان کے اعتقادات سے دور رہنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس ناول میں یہودی النسل اس لڑکی کے احساسات اور جذبات کے درپردہ ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں یہودیت واحد مذہب ہے جس کی بنیاد نسل پر ہے اور اس کے پیروکار دوسرے مذاہب کے ہم نوا کی شمولیت کو قبول نہیں کرتے اور نہ ہی اجازت دیتے ہیں۔ یہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی پر سوار ہو کر تباہی سے بچے تھے اور وہ آنے والی نسل کی بقا کو یقینی بنانے کے لیے گڑبڑ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ حسن منظر کا ناول "ماں بیٹی" آٹھ ابواب پر مشتمل ایک مختصر ناول ہے۔ اس کے دو مرکزی کردار اور دونوں نسوانی کردار ہیں۔ یہ ناول پاکستانی معاشرے میں مذہب کی حساسیت کے پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ مذہب کی تبدیلی یہاں کوئی کوئی معمولی بات نہیں اگر کوئی غیر مسلم اپنا مذہب تبدیل کرکے مسلمان ہونے کا اعلان کردے تو اس کے ہم مذہب افراد کا رویہ اور سلوک کس قدر منفی ہو سکتا ہے اس ناول میں اس صورتحال کو موضوع بنایا دیا ہے۔

حسن منظر کا کتابی شکل میں شائع ہونے والا پانچواں ناول "انسان اے انسان" بھی ۲۰۱۳ میں شہر زاد پبلشرز نے شائع کیا۔ یہ ناول ۵۹۱ صفحات پر مشتمل ایک طویل ناول ہے۔ یہ ناول انسانی زندگی کی فلسفیانہ اساس پر مبنی ہے۔ اس ناول کا آغاز تقسیم ہند کے عہد سے ہوتا ہے اور موجودہ عہد تک کی زندگی کو موضوع بناتا ہے۔ مہرونہ لغاری ناول کے موضوع کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "یہ ایک کرداری ناول ہے، اور ان تمام لوگوں کا ایک نمائندہ کردار بھی ہے جنھوں نے برصغیر کی تقسیم کے بعد ملک میں کرپشن کے کلچر کو فروغ دیا ہے۔ ناول گویا کہ برصغیر کے اس دور کی ایک تاریخی و سماجی دستاویزی شکل بھی ہے۔ ناول میں مصنف نے پرکھوں کی ان روایات اور رواجی سماجی کرداروں کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ جس کی بدولت نوجوان نسل اس نفسیاتی کج روی کا شکار ہو جاتی ہے جس کے بعد اس کا مذہب سے رشتہ احساس گناہ کا ہی رہ جاتا ہے۔ لیکن مثبت کرداری اوصاف پیدا کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔"(۱۸)

تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی سیاسی و سماجی صورتحال انتہائی خراب ہوتی گئی۔ آبادی کا دباؤ بڑھا، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کے مسائل پیدا کیے، مہاجرین جو کہ بڑی توقعات لے کر پاکستان آئے تھے ان کے لیے صورتحال انتہائی مایوس کن تھی۔ لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں آبادی کا دباؤ بڑھنے سے غربت اور بے روزگاری نے منفی رویوں کو ہوا دی۔ لوگ خصوصاً نوعمر اور نوجوان لڑکے جرائم کی طرف متقل ہوئے اس صورتحال کو پاکستان کے کئی ایک ناول نگاروں نے جن میں خدیجہ مستور حسین اور شوکت صدیقی بھی شامل ہیں نہایت چابک دستی سے موضوع بنایا۔ حسن منظر نے بھی اس ناول کی کہانی میں اس ساری صورتحال کو موضوع بنایا۔ اور اسی طبقے کے منفی کردار کو بھی سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے جو کہ طاقت اور مسائل پر اختیارات رکھتا تھا اور اس نے جائیدادیں ہتھیانے، املاک پر قبضہ کرنے اور اہم عہدوں کا استعمال کر کے ملک کے وسائل لوٹ کر اس بحران کو چنگاری دی۔ یہ ناول انسان کو اپنے گریبان میں جھانکنے اور ضمیر جھنجھوڑ کر اپنے اعمال اور افعال پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ حسن منظر نے اس ناول میں نقطہ نظر بھی پیش کیا ہے کہ مذہب سے دوری بعض روحانی بیماریوں کو جنم دیتی ہے اور یہ بیماریاں انسان کو فکری یا جبلی مخمصہ میں گرفتار کر دیتی ہیں۔ برصغیر کے کلچر میں مذہب ایک بنیادی شے ہے جس سے دوری انسان کو اپنی ذات کے اندر انجانے خوف اور محرومی کا شکار کرتی ہے۔ تلمیز الرحمن اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو صرف چھے سال کی عمر میں ناول کی کہانی کا موضوع بنتا ہے اور اس کی زندگی کا مکمل احاطہ کرتے ہوئے ناول نگار نے نقطہ نظر پیش کیا ہے کہ انسان ساری زندگی غلط اور درست کی نشاندہی، تلاش اور جستجو میں ساری زندگی گزار دیتا ہے اور جب زندگی ختم ہونے لگتی ہے تو خیال کرتا ہے کہ کاش زندگی دوبارہ مل جائے تو وہ اس بار اس کو زیادہ بہتر طریقے سے گزار سکے گا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "پھر اس نے نیند کو آنکھوں اور دماغ پر اترتے ہوئے محسوس کر کے کہا اب چاہے دوسری زندگی دے نہ دے میں نے اپنی تمام کمزوریوں کو بھانپ لیا ہے۔ اور ان سے نمٹ سکتا ہوں۔ بچی ہوئی اس زندگی میں بھی اور اگر زندگی پھر سے شروع کروں تو اس میں بھی میرا خیال ہے۔ یہی میری نجات ہے میری مکتی، میرا نروان ہے۔ بس اتنا کر کہ اگر دوسرا جنم دے تو موت کے ساتھ پہلی زندگی سے حاصل کیے ہوئے سبق نہ بھول چکا ہوں۔"(۱۹)

تلمیز الرحمن نے شعور کی آنکھ کھولنے کے بعد زندگی میں جس طرح لاپرواہی سی زندگی گزاری آخری عمر میں اس کو جیل میں گزرے ایام کے دوران زندگی کی ساری کہانی ایک فلم کی طرح یاد آتی ہے۔ اور زندگی کی غلطیاں ضمیر پر بوجھ بن کر پریشان کرتی ہیں لیکن اس صورتحال میں اللہ تعالی سے سچی توبہ کر کے وہ اپنے ضمیر کے بوجھ کو کم کرتا ہے اور زندگی کی لغزشوں پر دل کھول کر معافی مانگتا، پچھتاتا اور آئندہ کی زندگی کے لیے نیکی کے راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ ناول اپنی پیش کش کے اعتبار سے دلچسپ اور سبق آموز بھی ہے اور انسان کے لیے ایک آئینہ بھی۔

"اے فلک ناانصاف "حسن منظر کا اب تک شائع ہونے والا چھٹا اور سب سے آخری ناول ہے۔ اس ناول میں انھوں نے سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کو موضوع بنایا ہے۔ یہ وہ عہد ہے جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے دو شہزادے دارہ شکوہ اور اورنگ زیب عالمگیر کے درمیان تصادم کی صورتحال نے سلطنت کے استحکام کو بری طرح متاثر کیا۔

ناول کا عنوان مرزا غالب کے ایک شعر کے مصرعے کے نصف ٹکڑے سے لیا گیا ہے۔ اور اس عہد کی سیاسی تاریخ ہندوستان کو بیرون حملہ آوروں سے خطرات اور اس عہد کی ہندوستان کی جنگوں کے علاوہ اقتدار کی رسہ کشی کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا پہلا حصہ شہنشاہ شہاب الدین محمد خرم کی علالت کے بعد آگرہ میں پہلی لاقانونیت افراتری، مہنگائی اور بے چینی کی داستان پر مبنی ہے۔ دارہ شکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان بنیادی تنازعہ مغل تخت و تاج کے حصول، نظریاتی اختلافات اور شاہجہان کی جانشینی کی جنگ تھی۔ دارہ جہاں صوفیانہ خیالات اور ہندو مسلم اتحاد کا حامی تھا وہیں اورنگ زیب عالمگیر سخت گیر مذہبی خیالات رکھتا تھا۔ اس تنازعہ کی وجہ سے کئی خوفناک لڑائیاں ہوئیں اور اورنگ زیب نے ۱۶۵۸ء میں ایک لڑائی کے دوران دارہ شکوہ کو قتل کر دیا۔ دراصل شاہجہان نے دارہ شکوہ کو ولی عہد بنایا تھا جسے عالمگیر نے قبول نہیں کیا۔ لیکن بعد ازاں اورنگ زیب عالمگیر ایک خدا ترس اور انصاف پسند حکمران بن کر سامنے آیا۔ حسن منظر کے تمام ناولوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر ناول الگ الگ موضوع لیے ہوئے ہے۔ اور وہ صرف پاکستان کے اندرونی مسائل و معاملات کو ہی موضوع نہیں بناتے بلکہ انھوں نے تاریخ اور تہذیب کے ماضی اور حال میں سے چند ایک موضوعات منتخب کر کے ان موضوعات پر گہرے مطالعہ اور فہم کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں سماجی مسائل، انسانی نفسیات اور تہذیبی بحران کی گہری عکاسی موجود ہے۔ اس صدی کے ناول نگاروں نے اپنی تحریروں میں معاشرتی تضادات، اقتصادی اور سیاسی بحران اور انسانی رویوں کی نزاکت کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ حسن منظر کے ناول "العاصفہ"، "دھنی بخش کے بیٹے"، "وبا"، "بیر شیبا کی بیٹی" اور "ماں بیٹی"، "انسان اے انسان" اور "اے فلک ناانصاف" پاکستانی سماج ہندوستان کی گزشتہ صدیوں کی تاریخ، تقسیم ہند، امریکہ اور یورپ کی تہذیب کے پاکستانی اور مسلم محنت کشوں کی زندگی پر اثرات اور عرب معاشرے کے کئی غیر منصفانہ اور تلخ پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ اجمل کمال، حسن منظر کا ناول العاصفہ و دیگر نیا ادب، بائیس اگست ۲۰۰۷

BBC Urdu. Com

۲۔ مہرونہ لغاری، حسن منظر ادبی خدمات، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۴، ص: ۴۵

۳۔ اجمل کمال حسن منظر کا ناول العاصفہ و دیگر نیا ادب بائیس اگست ۲۰۰۷
BBC Urdu. Com
۴۔ ایضاً
۵۔ حسن منظر، ڈاکٹر، العاصفہ، شہر زاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۶، ص: ۳۷،۳۶
۶۔ ایضاً ص ۱۰۰،۹۹
۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، سوال یہ ہے، (مرتب نوشی انجم). بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۴، ص: ۷۶
۸۔ مہرونہ لغاری، حسن منظر ادبی خدمات، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۴ء، ص: ۱۶۲
۹۔ آصف فرخی، ڈاکٹر (مضمون نگار) حسن منظر کے دو مختصر ناول مشمولہ کہانی گھر کتابی سلسلہ ۴، ۳ مرتب زاہد حسن، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ ص: ۱۴۴
۱۰۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، شہر زاد پبلشرز کراچی، ۲۰۰۸ء، ص: ۵۱
۱۱۔ ایضاً ص: ۳۵
۱۲۔ ایضاً ص: ۱۰
۱۳۔ حسن منظر، وبا، شہر زاد پبلشرز کراچی، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۰۷
۱۴۔ ایضاً، ص: ۲۰۰
۱۵۔ آصف فرخی، ڈاکٹر (مضمون نگار) حسن منظر کے دو مختصر ناول مشمولہ کہانی گھر کتابی سلسلہ ۴، ۳ مرتب زاہد حسن، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ ص ۱۴۴
۱۶۔ مہرونہ لغاری، حسن منظر: ادبی خدمات، ص: ۲۰۱
۱۷۔ حسن منظر، بیر شیبا کی لڑکی اور ماں بیٹی، شہر زاد پبلشرز کراچی ۲۰۱۰ء، ص: ۴۹
۱۸۔ حسن منظر، انسان اے انسان، شہر زاد پبلشرز کراچی، ۲۰۱۳ء، ص: ۲۴۱
۱۹۔ ایضاً ص: ۵۸۶

References in Roman Script:

1. Ajmal Kamal, Hasan Manzar ka novel Al-Aasifa wa Deegar, Naya Adab, 22 August 2007, BBC Urdu.com
2. Mehruna Laghari, Hasan Manzar Adabi Khidmaat, Misaal Publishers, Faisalabad, 2014, p. 45
3. Ajmal Kamal, Hasan Manzar ka novel Al-Aasifa wa Deegar, Naya Adab, 22 August 2007, BBC Urdu.com
4. Ajmal Kamal, Hasan Manzar ka novel Al-Aasifa wa Deegar, Naya Adab, 22 August 2007, BBC Urdu.com
5. Hasan Manzar, Dr., Al-Aasifa, Shehrzad Publications, Karachi, 2006, pp. 36–37
6. Hasan Manzar, Dr., Al-Aasifa, Shehrzad Publications, Karachi, 2006, pp. 99–100
7. Jameel Jalibi, Dr., Sawal Yeh Hai (Murattib Noshi Anjum), Beacon Books, Multan, 2004, p. 76
8. Mehrunnisa Laghari, Hasan Manzar Adabi Khidmaat, Misaal Publishers, Faisalabad, 2014, p. 162

9. Asif Farrukhi, Dr. (Mazmoon Nigaar), “Hasan Manzar ke Do Mukhtasar Novels”, Mashmoola Kahani Ghar, Kitabi Silsila 3,4, Murattib Zahid Hasan, April–September 2012, p. 144
10. Hasan Manzar, Dhanni Bakhsh ke Betay, Shehrzad Publishers, Karachi, 2008, p. 51
11. Hasan Manzar, Dhanni Bakhsh ke Betay, Shehrzad Publishers, Karachi, 2008, p. 35
12. Hasan Manzar, Dhanni Bakhsh ke Betay, Shehrzad Publishers, Karachi, 2008, p. 10
13. Hasan Manzar, Waba, Shehrzad Publishers, Karachi, 2009, p. 107
14. Hasan Manzar, Waba, Shehrzad Publishers, Karachi, 2009, p. 200
15. Asif Farrukhi, Dr. (Mazmoon Nigaar), “Hasan Manzar ke Do Mukhtasar Novels”, Mashmoola Kahani Ghar, Kitabi Silsila 3,4, Murattib Zahid Hasan, April–September 2012, p. 144
16. Mehrunnisa Laghari, Hasan Manzar: Adabi Khidmaat, Misaal Publishers, Faisalabad, 2014, p. 201
17. Hasan Manzar, Bair Sheba ki Larki aur Maa Beti, Shehrzad Publishers, Karachi, 2010, p. 49
18. Hasan Manzar, Insaan Ae Insaan, Shehrzad Publishers, Karachi, 2013, p. 241
19. Hasan Manzar, Insaan Ae Insaan, Shehrzad Publishers, Karachi, 2013, p. 582